نبی کریم ﷺ: پیغمبر امن وسلامتی

Prophet Muhammad ﷺ: The Prophet of Peace

ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن*

Abstract

Peace is an absolute and universal rational category. It was sought by all religions. Islam was no exception to this rule. Dawn of Islam began in the tribal conditions of Arab. War was next to their social nature. Holy Quran uses the language of 'four holy' months which explains the necessity and significance of peace in socio cultural milieu of Islam. Very interestingly, peace brings about economic and social tranquility. Here peace may be an after effect of socio-economic tranquility. However, it is should be noted that peace is grounded in the establishment of justice.

The word 'peace' if ever can comprehensively be applied on single personality in the world history, it is only and only true for Muhammad – the prophet of Islam – ﷺ. It was in his credit that he turned a warrior nation into a peace loving and peace seeking nation. He provided two theoretical models for the understating of peace. Firstly, peace is brought as a result of war. Here peace is for short term. Secondly, in order to continue, on the other hand, one has to establish socio economic justice in order to make society peaceful. The paper argues that prophet Muhammad's ﷺ missionary efforts were peace headed and nothing else. He engaged in wars for a very brief period of time. Later, he successfully eradicated economic class consciousness, extremism, and instilled the values of patience and tolerance. This all paved the way to long lasting peace.

Keywords: *Peace, Warrior, Muhammad, Economic, Patience, Tolerance.*

---

*انچارج، ریجنل دعوہ سینٹر (سندھ)، کراچی۔

امن آج کی نہیں، ہمیشہ سے دنیا کی ضرورت رہی ہے، ایسی ضرورت، جس سے صرف پر امن قومیں ہی نہیں، جنگ جو اقوام بھی واقف تھیں۔ عربوں کی جنگ جوئی، کسی سے پوشیدہ نہیں، اس قوم کا بنیادی نظریہ حیات ہی جنگ جوئی پر مبنی معلوم ہوتا ہے، مگر عرب بھی اپنی معاشی اور سماجی ضرورتوں کے تحت امن کے قیام کے لیے راہیں تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے تھے، ''اشہرِ حرم'' کا تصور اسی ضرورت سے نکلا، جسے اسلام نے بھی بعض شرائط کے ساتھ برقرار رکھا۔ اس سے امن کے بارے میں انسانی تصور واضح ہو سکتا ہے۔ امن ہماری ترقی اور استحکام دونوں کے لیے ضروری ہے، لیکن امن کا قیام بہ جائے خود واضح مقصد ہونے کے باوجود از خود قائم ہونے والی حقیقت نہیں، یہ ایک اور بڑی حقیقت عدل وانصاف پر منحصر ہے۔ اس لیے امن کے قیام کے لیے عدل وانصاف کا قیام ناگزیر ہے۔

جناب رسول اللہ ﷺ کو پیغمبر امن و سلامتی بھی کہا جا سکتا ہے، بل کہ یہ عنوان کسی ذات پر صادق آتا ہے تو وہ صرف ذات رسالت مآب ﷺ ہے، کیوں کہ آپ نے عرب جیسی جنگ جو قوم میں آنکھ کھولی، ان ہی میں پلے بڑھے، اپنی عمر عزیز کے ابتدائی اور نہایت قیمتی ۴۰ برس ان ہی میں بسر کیے، اور ان ہی کو بالآخر دنیا بھر کے لیے سفیران امن کے پیکر میں ڈھال دیا۔ کہنے کو تو یہ بات ایک سطر میں کہہ دی گئی، مگر اس کے لیے کیا کچھ کیا گیا؟ فکری، نظریاتی، تربیتی، علمی اور عملی سطحوں پر کس قدر محنت سے کام لیا گیا؟ اس کی چند جھلکیاں تو تاریخ و سیرت سے میسر آسکتی ہیں، اس کا درست خاکہ ذہن میں بنانا ممکن ہی نہیں۔ البتہ اس محنت کے دو پہلو نہایت اہم ہیں، ایک تو دنیا کو پہلی بار یہ تصور آپ ﷺ نے دیا کہ جنگ نہایت نامناسب سہی، مگر امن کے قیام کے لیے ناگزیر بھی ہو جاتی ہے، اس لیے اصل یہ نہیں کہ جنگ کا انکار کر دیا جائے، اصل یہ ہے کہ جنگ کو ضابطے اور قاعدے کا پابند بنا دیا جائے، اور دوسرے یہ کہ امن چوں کہ عدل وانصاف پر منحصر ہے، اس لیے عدل کے قیام اور عادلانہ معاشرے کی تشکیل کے لیے کوشش کی جائے۔ پہلا مرحلہ قلیل المدتی اور دوسرا طویل المدتی منصوبہ بندی کا حصہ تھا۔ ان سطور میں اس حوالے سے چند معروضات پیش کی جائیں گی۔

پس منظر

کسی بھی بڑی تاریخی حقیقت کو جاننے کے لیے اور کسی بھی بڑے اقدام کا درست تجزیہ کرنے کے لیے اس کا پس منظر جاننا از حد ضروری ہوتا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جس ماحول میں جناب رسول اللہ ﷺ نے انسانیت کو امن جیسی بنیادی ضرورت سے مستفید کیا اور بد امنی سے نجات دلائی، وہ کیا تھا؟

انسانی خوبی ہر حال میں خوبی ہی کہلاتی ہے، لیکن ماحول کے تناظر میں اس خوبی کا وزن کم زیادہ ضرور ہو سکتا ہے، ایک شخص مسجد کے پہلو میں رہتا ہے، اسے فراخی بھی حاصل ہے، اس کی مصروفیت بھی زیادہ نہیں، وہ ہر نماز میں تکبیر اولی کے ساتھ صف اول میں نظر آتا ہے، یہ سعادت ہے، مگر اس کے مقابل ایک شخص مزدوری کر کے پیٹ پالتا ہے، کبھی اس کی رات کہیں اور دن کہیں بسر ہوتی ہے، وہ دن کے اوقات میں نماز کے وقت کا خیال رکھتے ہوئے، محض فرض نماز ہی ادا کرتا ہے، اب اس کا تقابل ممکن نہیں۔ اس کا پس منظر

ہی اسے سہولت عطا کرتا ہے۔ جب قیام امن کی کوششوں کا ذکر کرتے ہیں اور پھر جناب رسول اللہ ﷺ کی محنت کا بیان کرتے ہیں تو اس کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔

عرب جنگ جو تھے اور بلا کے جنگ جو۔ عربوں کی ثقافت کا بڑا حصہ اسی جنگ جوئی کا مظہر نظر آتا ہے۔ کسی بھی زبان کا ادب اس زبان کے بولنے والوں کے ماحول کا سب سے بڑا عکاس اور گھر کی گواہی کی حیثیت رکھتا ہے، عربوں کے ہاں ادب کا بڑا حصہ شاعری پر مشتمل تھا۔اس شاعری میں جنگ جوئی کی کیا کیفیت ہے؟اس کا مطالعہ دل چسپ بھی ہے اور ان کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مفید بھی۔

اودّاک بن ثُمیل مازنی اپنے ممدوح کی جنگ جوئی کی یہ کیفیت بیان کرتا ہے:

اذا استنجدوا لم یسالوا من دعاھم

لایة حرب ام بای مکان (۱)

جب ان سے مدد طلب کی جاتی ہے تو وہ یہ سوال نہیں کرتے کہ انہیں بلانے والا کون ہے اور نہ یہ دیکھتے ہیں کہ کس جنگ کے لیے یا کس جگہ کے لیے بلایا جارہا ہے۔

حصین بن ہمام اپنی بہادری کو ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے:

نفلق ھاما من رجال اعزة

علینا و ھم کانوا اعق و اظلما (۲)

ہم ذی عزت لوگوں کی کھوپڑیوں کو پارہ پارہ کردیتے ہیں اگرچہ وہ ظالم و جابر ہی کیوں نہ ہوں۔

بنی عقیل کا ایک شاعر اپنے کلام سے کمال کا نکتہ پیدا کرتا ہے، کہتا ہے:

و نبکی حین نقتلکم علیکم

و نقتلکم کانا لا نبالی (۳)

ہم تمہیں قتل کردینے کے بعد (قرابت داری نبھاتے ہوئے) تم پر روتے ہیں، مگر جب قتل کرتے ہیں تو کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

سوار بن مضرب سعدی اگرچہ اس حد تک نہیں جاتا، لیکن جنگ جوئی اس کی بھی فطرت کا حصہ ہے:

و انی لا ازال اخا حروب

اذا لم اجن کنت مجن جان (۴)

میں ہمیشہ لڑائیوں میں گھرا رہتا ہوں، اگر خود ظلم نہیں کرتا تو ظالموں کی سپر بن جاتا ہوں۔

اور دشمن کو مکافات کی دھمکی دیتے ہوئے ایک شاعر کہتا ہے:

انختم علینا کلکل الحرب مرة

فنحن منیخوھا علیکم بکلکل (۵)

جس طرح تم نے ہمارے اوپر لڑائی کے اونٹ بٹھا کر ہمیں چور چور کر دیا تھا، ہم بھی تمہیں اسی طرح پاش پاش کر دیں گے۔

غیرت وحمیت کی بناپر اپنے مقتول پر نوحہ کرنا بھی عیب سمجھا جاتا تھا، ایک شاعر کہتا ہے:

ولا تراهم وان جلت مصيبتهم

مع البكاة على من مات يبكونا (۶)

گو کتنی ہی بڑی مصیبت ہو، لیکن ان کو مرنے والے پر رونے والوں کے ساتھ روتے ہوئے نہ دیکھو گے۔

عمرو بن کلثوم کہتا ہے:

معاذ الله ان تنوح نساءنا

على هالك او ان نضبح من القتل (۷)

خدا نہ کرے کہ ہماری عورتیں مقتل پر نوحہ کریں یا ہم قتل سے گھبرائیں۔

ذوالاصبع عدوانی اپنے چچازاد بھائی کو دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے:

يا عمرو الا تدع شتمي و منقصتي

اضربك حتى تقول الهامة اسقوني (۸)

اے عمرو اگر تو مجھے گالیاں دینا اور میری تحقیر کرنا نہیں چھوڑے گا تو میں تجھے مار ڈالوں گا (اور عربوں کے عقیدے کے مطابق) تیری کھوپڑی سے نکلنے والا الو چلاتا رہے گا کہ مجھے سیراب کرو۔

اور اعشیٰ کا کہنا ہے:

لقد زعمتم بانا لا نقاتلكم

انا لامثالكم يا قومنا قتل (۹)

تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ ہم تم سے جنگ نہیں کریں گے، حال آں کہ اے قوم ہم تو تم جیسوں کے لیے بڑے خوں خوار ہیں۔

اور قطامی فخریہ طور پر اپنی جنگ جویانہ کیفیت اس طور بیان کرتا ہے:

و احيانا على بكر اخينا

اذا ما لم نجد الا اخانا (۱۰)

اگر کبھی ہمیں (قتل وقتال کے لیے) کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا تو ہم اپنے برادر وحلیف قبیلے پر ہی حملہ کر دیتے ہیں۔

اور ایک شاعر رقاد بن منذر رفقط اس بناپر قبائل میں لڑائی چھڑ جانے کی دعا کرتا ہے، تا کہ اسے اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کا موقع ملے، کہتا ہے:

اذا المهرة الشقراء ادرك ظهرها

فشب الاله الحرب بين القبائل (۱۱)

میرا گھوڑا سواری کے قابل ہو جائے تو اللہ قبائل میں جنگ کی آگ بھڑکا دے۔

عربوں کی جنگ جوئی کوئی شاعرانہ تخیل نہیں تھا، تاریخ سے یہ تخیل عملی روایت کے طور پر سامنے آتا ہے، چناں چہ عام سیرت نگار یہ بات اہتمام سے لکھتے ہیں کہ اہل عرب کی سفاکی کا یہ عالم تھا کہ زندہ جانوروں کو درخت وغیرہ سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے۔ لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے۔ منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔ مجرموں کو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضا ان میں باندھ دیتے اور ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے اس طرح مجرموں کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔ کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے، ان کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے۔ کسی شخص کو قید کر کے اس کا کھانا پانی بند کر دیتے حتیٰ کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔(۱۲)

عربوں کے دور جاہلیت میں جذبۂ انتقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ عرب جو شراب پر جان دیتے تھے انتقام لینے سے قبل اپنے لیے شراب پینا حرام سمجھتے تھے۔(۱۳)

اس طرح ایک بار عمرو بن اہتم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں احنف بن قیس کو مخاطب کر کے کہا تھا:

ایک وہ وقت تھا جب ہم دونوں جاہلیت کی دنیا میں بستے تھے، اس وقت عزت کا مستحق وہ سمجھا جاتا تھا جو زیادہ جاہل اور وحشی ہوتا اور جہالت یہ تھی کہ ہم نے تمہارا خون بہایا اور تمہاری عورتوں کو قیدی بنایا آج ہم اسلام کے گھر میں بیٹھے ہیں، آج عزت کا مستحق وہ ہے جو زیادہ بردبار اور حلیم ہے۔ پس اللہ ہمیں اور تمہیں معاف فرمائے(۱۴)

امن عالم کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقدامات

اس پس منظر میں ہمارے لیے اہم ترین سوال یہ ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ حیثیت پیغمبر امن و سلامتی کیا قدامات کیے؟ کیوں کہ جس پس منظر کی ایک جھلک صفحات ماسبق میں ہم پیش کر چکے، ان میں امن و سلامتی کا بیڑا اٹھانا اور ایسی جنگ جو قوم کو دنیا بھر کی امن و سالمیت علم بردار بنا دینا طویل منصوبہ بندی، مسلسل محنت اور ہم جہت کاوشوں سے ہی ممکن تھا۔ ہم ذیل میں اس حوالے سے ان خاص اقدامات کا ذکر کریں گے، جن کے ذریعے اس منزل کا حصول ممکن ہو سکا۔

وحدت انسانی کا تصور

تشدد اور بدامنی کی ایک بنیاد علاقیت کا پختہ تصور بھی ہے، قرآن کریم نے ہر طرح کی تفریق کے خاتمے کے لیے وحدتِ انسانی کا تصور دیا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا(۱۵)

اے اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

اس کی تشریح میں علامہ نووی فرماتے ہیں:

تعاملوا و تعاشروا معاملة الاخوة و معاشرتهم فی المودة و الرفق و الشفقة و الملاطفة و التعاون فی الخیر و نحو ذلک مع صفاء القلوب و النصیحة بکل حال (۱۶)

اسلام کا مقصد یہ ہے کہ بے جا انسانی تفریق اور مصنوعی حد بندیاں ختم ہو جائیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حوالے سے ہدایات بھی عطا فرمائیں اور عملی تربیت بھی فرمائی، مثلاً ایک موقع پر فرمایا:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیاله (۱۷)

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، تو وہی شخص اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہوگا جو اس کی عیال کے ساتھ حسن سلوک کرے گا۔

اور ایک موقع پر یہ ہدایت تلقین فرمائی:

و الناس بنو آدم و خلق اللہ آدم من التراب (۱۸)

تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔

دین میں زبردستی کی ممانعت

کسی پر مذہبی جبر بھی تشدد اور بدامنی کا راستہ کھولتا ہے۔ اسلام نے اس سلسلے میں ہر طرح سے واضح فرمادیا کہ اس کے ہاں زبردستی کرنے اور جبراً کسی کو مسلمان کرنے کی ہرگز کوئی صورت نہیں، اس لیے کہ اسلام صرف ظاہری اعمال کا نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قلوب واذہان کی مکمل فرماں برداری کا نام ہے، اور یہ عمل زبردستی ممکن ہی نہیں۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (۱۹)

دین میں زبردستی نہیں۔

معبودان باطل کو بھی برا کہنے کی ممانعت

اس انسانی کائنات میں یہ امر ممکن ہی نہیں، بل کہ اللہ تعالیٰ کی حیثیت کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ سب انسان اور پوری کائنات ایک ہی مذہب و مسلک کی پابند ہو جائے، سو جب یہ اختلاف ہے اور فطری ہے تو اسے بھی بدامنی اور شدت پسندی کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ اس لیے اسلام ہر مسلک و مذہب کا احترام کرتا ہے اور ہر ایک کے احساسات کا مکمل خیال رکھتا ہے۔ وہ کسی کو برا بھلا کہنے اور سب وشتم کرنے کی اجازت نہیں دیتا، قرآن حکیم ہی میں ارشاد ہے:

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ (۲۰)

اور تم ان کے معبودوں کو جنہیں وہ خدا کے سوا پکارتے ہیں برامت کہو، کیوں کہ پھر وہ بغیر سمجھے اللہ کو برا کہنے لگیں گے۔

انسانی جان کی اہمیت

شدیت خواہ کسی نوعیت کی ہوں اور امن مخالف اور بے جا ہی جسے بھی پروان چڑھیں ان کی زد ری انسانیت ہر آتی ہے، انسانی افکار بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں اور روز مرہ کے امور بھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود انسانی جان کو بھی خطرات لاحق ہوتے ہیں، اسلام کی نظر میں انسانی جان کی بے حد اہمیت ہے، اس بنا پر وہ ان تمام خطرات کا سدِ باب کرتا ہے، قرآن حکیم میں اللہ تعالی نے فرمایا:

مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعاً(۲۱)

جو شخص کسی کو مار ڈالے بغیر کسی جان کے بدلے کے یا زمین پر فساد پھیلانے کے بغیر تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر ڈالا۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

وَ لَاتَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلاَّ بِالْحَقِّ(۲۲)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو مزید معنویت عطا کردی ہے، چنانچہ اس جان کو قتل نہ کرو جس کا خون اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق پر۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھا اور یہ فرماتے سنا:

مااطیبک واطیب ریحک مااعظمک واعظم حرمتک والذی نفس محمد بیدہ لحرمۃ المومن اعظم عند اللہ حرمۃ منک مالہ ودمہ وان یظن بہ الاخیرا(۲۳)

تو کتنا پاکیزہ ہے اور تیری خوشبو کتنی پیاری ہے تو کتنا عظیم المرتبہ ہے، لیکن قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے مومن کی جان ومال کی حرمت اللہ کے نزدیک تجھ سے زیادہ ہے اس لیے ہمیں مومن کے ساتھ نیک خیال رکھنا چاہیے۔

اسی طرح حضرت ابو سعید فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا:

الا ان احرم الایام یومکم ھذا الا و ان احرم الشھور شھر کم ھذا الا و ان احرام البلد بلدکم ھذا الا وان دماء کم و اموالکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی شھر کم ھذا فی بلد کم ھذا(۲۴)

خبردار تمام دنوں میں سب سے زیادہ حرمت والا دن یہ ہے، تمام مہینوں میں سب سے زیادہ ذی شرف مہینے یہ ہے اور تمام شہروں میں سب سے زیادہ افضل شہر یہ ہے خبردار تمہاری جان تمہارے مال ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح اس شہر اس مہینہ اور اس دن کی حرمت ہے۔

نیز حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لزوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل مومن بغیر حق(۲۵)

اللہ کے نزدیک دنیا کا ختم ہو جانا ایک مسلمان کے ظلماً قتل سے زیادہ سہل ہے۔

اور حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اول مایقضی بین الناس یوم القیمۃ فی الدمآء(۲۶)

قیامت کے روز لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خون کا فیصلہ کیا جائے گا۔

ظلم کی ممانعت

ہم ابتدا ہی میں یہ نکتہ واضح کر آئے ہیں کہ امن در حقیقت عدل وانصاف کے قیام پر منحصر ہے، اس کے بغیر خصوصاً معاشرتی عدل کے بغیر معاشرے میں امن واستحکام ممکن نہیں، اور عدل کی حد ظلم ہے، اس لیے رسول اللہ علیہ وسلم نے اس حوالے سے بھی خاص اہتمام سے ہدایات فرمائی ہیں، نیز اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ظلم کے نقصانات اس سے بھی کہیں زیادہ اور کثیر الجہت ہیں، اس لیے اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے، قرآن حکیم میں فرمایا:

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ(۲۷)

اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اتقوا الظلم فان الظلم ظلمات یوم القیامۃ(۲۸)

ظلم سے بچو، کیوں کہ ظلم روز قیامت اندھیروں کی صورت میں ہو گا۔

دین میں غلو کی ممانعت

دین کے معاملے میں غلو اور حدود سے تجاوز کرنا بھی ناپسندیدہ ہے، کیوں کہ یہ بھی امن واستحکام کے لیے خطرات پیدا کر سکتا ہے، اور دین کی بنیادی تعلیم اور درست تصور کو بھی بدل ڈالتا ہے، قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ(۲۹)

تم اپنے دین کے معاملے میں غلو نہ کرو۔

یہاں غلو سے مراد حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اس غلو کا نتیجہ بھی شدت پسندی اور انتہا پسندی کی صورت میں نکلتا ہے، اور جو لوگ غلو سے دوچار ہو جاتے ہیں وہ پھر اعتدال سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے اس سے بھی شریعت نے منع فرمایا۔ حدیث میں فرمایا گیا:

ایاکم والغلو فی الدین فانما ھلک من کان قبلکم بالغلو فی الدین(۳۰)

تم دین میں غلو سے بچو، کیونکہ، پچھلی امتیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔

شدت سے بچنے کی تاکید

انسانی مزاج جب بھی اعتدال اور توازن کی حدود سے باہر نکلے گا، ان مسائل سے ضرور دوچار ہوگا، اس لیے کہ شدت پسندی خواہ کسی معاملے میں ہو، انسان کو نقصان پہنچاتی ہے، اس لیے اسلام نے دین کے معاملے میں بھی اس سے بچنے کی تاکید کی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تشددوا علی انفسکم فیشدد علیکم فان قوما شددوا علی انفسهم فشدد الله علیهم، فتلک بقایاهم فی الصوامع والدیار (۳۱)

تم اپنے آپ پر سختی نہ کرو ورنہ تمہارے اوپر سختی کی جائے گی، کیوں کہ ایک قوم نے اپنے آپ پر سختی کی، پھر اللہ نے بھی ان پر سختی کی، تو ان ہی لوگوں کے باقیات ہیں جو گرجوں اور خانقاہوں میں نظر آتی ہیں۔

طبقاتی کش مکش کا خاتمہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طبقاتی کش مکش کے خاتمے کی جانب بھی توجہ دلائی ہے، کیوں کہ یہ طبقاتی کش مکش بھی بسا اوقات انتہا پسندانہ جذبات کی ترویج وفروغ کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لیے اسلام اس کا بھی انسداد کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ألا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا الاسود علی احمر (۳۲)

خبردار کسی عربی کو عجمی پر کسی عجمی کو عربی پر اور کسی سرخ کو کالے پر اور کسی کالے کو سرخ پر کچھ فضیلت حاصل نہیں، فضیلت کا مدار تو صرف تقویٰ ہے۔

اعتدال کی تلقین

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر معاملے میں راہ اعتدال اپنانے کی تلقین کی ہے، کیوں کہ راہ اعتدال پر گامزن ہونے والا شخص کبھی بھی کسی بھی معاملے میں انتہا پسندانہ جذبات کا شکار نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما احسن القصد فی الغنی ما احسن القصد فی الفقر ما احسن القصد فی العبادة (۳۳)

کیا ہی اچھی ہے میانہ روی دولت مندی میں، کیا ہی اچھی ہے میانہ روی مفلسی میں، کیا ہی اچھی ہے میانہ روی عبادت میں۔

ایک اور روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا:

القصد القصد تبلغوا (۳۴)

میانہ روی، میانہ روی، اختیار کرو، تم منزل پر پہنچ جاؤ گے۔

خود آپ ﷺ کے طرز عمل کے بارے میں ایک صحابی گواہی دیتے ہیں:

کانت صلاتہ قصدا و خطبتہ قصداً (۳۵)

آپ کی نماز معتدل ہوتی تھی اور آپ کا خطبہ بھی معتدل ہوتا تھا۔

ایک اور روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

خیر الامور اوسطھا (۳۶)

بہترین عمل میانہ روی والا ہے۔

اسی طرح حضرت علیؓ سے منقول ہے، فرمایا:

علیکم بالنمط الاوسط (۳۷)

تم پر لازم ہے کہ درمیانہ راستہ اختیار کرو۔

صبر کی تاکید

امن و سلامتی کے راستے پر چلنے والا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حالات کے سبب سخت دباؤ کا شکار ہو جائے اور اس کے لیے جادۂ اعتدال پر گامزن رہنا ممکن نہ رہے، ایسے میں صبر ہی حالات کو سدھارنے کا بہترین ذریعہ ہے، کیوں کہ انسان جب غیر متوازن جذبات کا شکار ہوتا ہے تو اس کے لیے صبر و استقامت سے کام لینا مشکل ہو جاتا ہے، اسی طرح جب تک وہ صبر و ثبات سے کام لیتا رہتا ہے، وہ راہ اعتدال پر گامزن رہتا ہے، اس لیے انسداد انتہا پسندی کے حوالے سے صبر کی بہت اہمیت ہے، اسی لیے اسلام نے اس کی بھی تلقین کی ہے، قرآن حکیم میں صبر کے بہت سے فضائل اور اس کی اہمیت بیان ہوئی ہے۔ صبر کو اولوالعزم پیغمبروں کا طریقہ بتایا گیا ہے (۳۸) صبر پر اعلیٰ ترین کامیابیوں کی بشارت ہے (۳۹) صبر قیادت عالم کا زینہ ہے۔ (۴۰) صبر حفاظت کا یقینی ذریعہ ہے (۴۱) حتیٰ کہ صبر وہ چیز ہے جو آدمی کو بے حساب اجر کا مستحق بناتی ہے۔ (۴۲)

اس موضوع کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وضاحت سے بیان فرمایا ہے، چناں چہ ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما رزق عبد اخیر أله ولا اوسع من الصبر (۴۳)

کسی شخص کو صبر سے بہتر اور صبر سے بڑا عطیہ نہیں دیا گیا۔

اور حضرت عمر کا قول ہے:

وجدنا خیر عیشنا بالصبر (۴۴)

ہم نے اپنی زندگی کا سب سے بہتر صبر کے ذریعے پایا۔

عدل وانصاف

امن وامان، سالمیت اور تحفظ انسانیت کی دوسری بنیاد صرف اور صرف عدل وانصاف میں پوشیدہ ہے۔ ایسا عدل اور ایسا انصاف جو ایک معاشرے میں بسنے والے تمام افراد کو مساوات کی ایسا لڑی میں پرودے کہ ان کے مابین، مذہب، نسل، قبیلے، رنگ اور زبان کی بنیاد پر دو الگ الگ معیار قائم نہ کیے جائیں، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا یہ سارا نظام جو آسمان سے زمین تک پھیلا ہوا ہے صرف اللہ تعالی کے عدل وانصاف کی بنا پر قائم ہے، اور قرآن کریم نے اللہ تعالی کی وحدانیت کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ وہ اپنی تمام مخلوقات پر اپنی حکم رانی مکمل انصاف، اور کامل عدل کے ساتھ قائم کیے ہوئے ہے، ارشاد خداوندی ہے:

ترجمہ: اللہ تعالی، فرشتوں اور اہل علم نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ انصاف قائم کرنے والا ہے، اس کے سوا کسی کی بندگی جائز نہیں وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے۔(۴۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عدل وانصاف صرف نظام حکومت وسلطنت کے برقرار رکھنے کے لیے ضروری نہیں۔ یہ وہ صفات ہیں جن کا ہونا ہر شعبے میں ضروری ہے۔ ان کی اس اہمیت کے پیش نظر قرآن کریم میں جہاں چند اچھے کاموں کے کرنے کا حکم مذکور ہے، وہاں سب سے پہلے عدل کا ذکر ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۴٦)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

دراصل جس عہد میں قرآن کریم نے یہ حکم دیا کہ اس وقت بھی یہی ہوتا تھا کہ عام طور پر شاہی حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون سے بالاتر ہوتے تھے، جب کہ رعایا کی ذراسی بے ادبی وگستاخی بھی ناقابل معافی اور سخت ترین سزا کی موجب ہوتی تھی۔ اس کے برعکس آپ ﷺ نے اسلامی قانون کی بالادستی قائم کی، امیر ومامور، حاکم ومحکوم اور راعی ورعایا کو قانون کی نظر میں یک ساں اور مساوی حیثیت کا حامل قرار دیا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دیگر معاملات کی طرح یہاں بھی قانون الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ بہ طور مثال اپنی ذات اور اپنے اہل بیت کے ذریعے پیش فرمایا۔ زکوۃ صدقات اور عشر وغیرہ خاندان نبوت پر بھی عام مسلمانوں کی طرح واجب تھے۔ ایک بار ایک مخزومی عورت فاطمہ بنت قیس نے چوری کی۔ آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چوں کہ اس کا تعلق معزز خاندان سے تھا اس لیے صحابہ کرام نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو آپ کی خدمت میں بھیج کر سفارش کرانی چاہی۔ آپ ﷺ حضرت اسامہ سے بہت زیادہ انس رکھنے کے باوجود ان پر غصے ہوئے، اور فرمایا کہ پہلی امتیں اسی بنا پر تباہ وبرباد ہوئیں کہ ان کے ہاں جب کوئی معمولی آدمی جرم کرتا تو اس کو سزا دیتے اور جب وہی جرم کسی بڑے رتبے والے آدمی سے سرزد ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ پھر فرمایا:

اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا(۴۷)

یہ تھا آپ ﷺ کا عدل وانصاف جس نے فلاحِ انسانیت پر مبنی مثالی اور کامیاب معاشرے کی بنیاد رکھی۔

آپ ﷺ نے جس عالم گیر عدل وانصاف کی ترغیب دی اور اس کو عملی طور پر رائج کر کے دکھایا، اس کی رو سے سب انسان برابر تھے اور آپ ﷺ اسلام کے اور اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی اسی انصاف سے کام لیتے تھے جس کے ذریعے اپنے صحابہ کے مابین فیصلے فرماتے، اور کسی سے اس بنا پر تعصب کا مظاہرہ نہ ہوتا کہ وہ شخص مسلمان نہیں۔ یہود کی دشمنی کوئی پوشیدہ امر نہیں، اس کے باوجود آپ ﷺ نے کسی معاملے میں بھی ان کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں فرمایا۔ خیبر کی زمین جب تقسیم کی گئی تو ایک مرتبہ عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کھجوروں کی بٹائی کے لیے گئے۔ ان کے چچازاد بھائی محیّصہ رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ تھے۔ عبداللہ ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ کسی نے ان پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیا اور ان کی لاش ایک گڑھے میں ڈال دی۔ محیصہ نے آپ ﷺ کے پاس استغاثہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے ان کو قتل کیا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر یہودیوں سے حلف لیا جائے۔ محیّصہ نے عرض کی یہودیوں کی قسم کا کیا اعتبار؟ یہ تو سو مرتبہ بھی جھوٹی قسمیں کھالیں گے۔ خیبر میں یہود کے علاوہ اور کوئی قوم آباد نہیں تھی، اس لیے یہ امر یقینی تھا کہ عبداللہ کے قاتل یہودی ہی ہیں۔ مگر چوں کہ عینی شہادت موجود نہ تھی اس لیے آپ ﷺ نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی اور عبداللہ کی دیت کے سو اونٹ بیت المال سے دلوا دیے۔(۴۸)

یہ آپ ﷺ کے عدل ہی کا نتیجہ تھا کہ یہودی اسلام اور آپ کے شدید ترین دشمن ہوتے ہوئے بھی اپنے مقدمات آپ ہی کے پاس لاتے تھے اور آپ ﷺ کی شریعت کے مطابق فیصلے کرواتے تھے۔

اختتام

انسانی زندگی اور اس پر مبنی یہ معاشرہ چند اصولوں پر استوار ہے، ان میں سب سے اہم یہ نکتہ ہے کہ یہاں آنے والے پر ذی روح کو جینے اور اپنے عرصۂ حیات کو بسر کرنے کا حق اور اختیار حاصل ہے۔ چند ناگزیر صورتوں کے علاوہ یہ حق اس سے چھیننے کا کسی کو اختیار حاصل نہیں۔ مشیت الٰہی بھی یہی معلوم ہوتی ہے، اور قرآن وسنت میں اس کا بیان مختلف اسالیب میں موجود ہے کہ انسانیت کا مقام یہی ہے کہ اس کا ہر صورت میں احترام کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے پوری انسانی دھرتی پر امن وامان کا ماحول قائم کرنا ضروری ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ماحول میں اپنے کار نبوت کی ابتدا فرمائی، وہ نہایت خطرناک ماحول تھا، ان حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی جنگ جوئی کو امن وسالمیت کی ایک زندہ تحریک سے بدل دیا۔ اس مقصد کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اقدامات تجویز فرمائے۔ یہ اقدامات جب اس اپنی انتہا پر پہنچے ہوئے معاشرے کو بدلنے میں کام یاب ہو گئے، تو آج کے حالات میں ہمیں ان سے فیض اور رہ نمائی کیوں میسر نہیں آسکتی؟ ضرورت اور طلب موجود ہے، سامانِ رہ نمائی میسر ہے، عمل کی راہ متعین ہے، اب صرف قدم اٹھانے اور سفر شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت فرمائے،اور عمل سے ہمارا باطن منور فرمادے۔آمین

حواشی وحوالہ جات

۱۔الطائی،ابو حاتم حبیب بن اوس،**دیوان الحماسہ**، باب الحماسہ، میر محمد کتب خانہ، کراچی، بلاسن طباعت، ص ۲۴۔

۲۔ایضاً ص ۳۳۔

۳۔ایضاً ص ۳۴۔

۴۔ایضاً ص ۲۴۔

۵۔ایضاً ص ۴۳۔

۶۔ایضاً ص ۲۱۔

۷۔ایضاً ص ۸۲۔

۸۔زیات، احمد حسن، **تاریخ ادب عربی**، قدیمی کتب خانہ، کراچی، بلاسن طباعت، ص ۳۲ ۔

۹۔ایضاً ص ۴۵۔

۱۰۔الطائی،**الحماسہ**، ص ۶۲۔

۱۱۔ایضاً ص ۹۶۔

۱۲۔نعمانی، شبلی۔**سیرت النبی ﷺ**،دارالاشاعت، کراچی، ج ۴، ص ۱۶۱۔

۱۳۔آلوسی، محمود شکری۔**بلوغ الارب فی احوال العرب**،اُردو ترجمہ،ڈاکٹر پیر محمد حسن، مرکزی اُردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۷ء، ج ۳، ص ۴۹۰۔

۱۴۔زیات،**تاریخ ادب عربی**، ص ۱۲۰۔

۱۵۔حنبل، امام احمد،**المسند**،داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۳ء، ج ۳، ص ۱۹۶۔

۱۶۔نووی، ابوزکریا یحییٰ بن شرف الدین (م ۶۷۶ھ)،**شرح النووی علی صحیح المسلم**،داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۹۲ھ، ج ۱۶، ص ۱۱۶۔

۱۷۔طبرانی،**المعجم الاوسط**،دارالحرمین، قاہرہ، ۱۴۱۵ھ، ۸۶، ۱۰۔

۱۸۔ترمذی، امام محمد بن عیسیٰ، **سنن الترمذی**، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء، ج ۵، ص ۱۸۰۔ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، **سنن ابو داؤد**، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء، ج ۴، ص ۳۶۷۔

۱۹۔**البقرہ**، آیت: ۲۵۶۔

۲۰۔**الانعام**، آیت: ۱۰۸۔

۲۱۔**المائدہ**، آیت: ۳۲۔

۲۲۔**الانعام**، آیت: ۱۵۱۔

۲۳۔سیوطی، جلال الدین،**الدر المنثور**، دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۳ء، ج ۷، ص ۵۶۵۔

۲۴۔ابن ہشام، ابو محمد عبدالملک،**السیرۃ النبویہ**، دارالمعرفہ، بیروت، ۱۹۷۸ء، ج ۴، ص ۲۳۱۔

۲۵۔ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید، **سنن ابن ماجہ**، دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء، ج ۶، ص ۴۱۶۔

۲۶۔نسائی، ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب، **السنن المجتبیٰ**، باب تعظیم الدم، دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء، ج۳، ص۱۶۶۔

۲۷۔**الحج**، آیت: ۷۱۔

۲۸۔قشیری، **مسلم**، ج۴، ص۱۷۸۔

۲۹۔**النساء**، آیت: ۱۷۱۔

۳۰۔احمد، **المسند**، ج۱، ص۲۱۵۔

۳۱۔ابوداؤد، **سنن**، ج۴، ص۲۹۹۔

۳۲۔احمد، **المسند**، ج۶، ص۵۷۰۔

۳۳۔ابن کثیر، حافظ عمادالدین، **التفسیر العظیم**، دارالفکر، بیروت، ۱۴۰۱ھ، ج۳، ص۳۲۶۔

۳۴۔بخاری، محمد بن اسماعیل، **الجامع الصحیح**، ج۳، ص۸۷۔

۳۵۔ابن حبان، ج۷، ص۱۴، رقم ۲۸۰۲۔

۳۶۔قرطبّی، محمد بن احمد بن ابی بکر، ابوعبداللہ، **تفسیر قرطبّی**، دارالشعب، قاہرہ، ۱۳۷۲ھ، ج۵، ص۳۴۳۔

۳۷۔قرطبّی، تفسیر **قرطبّی**، ج۲، ص۱۵۴۔

۳۸۔**الاحقاف**، آیت: ۳۵۔

۳۹۔**الاعراف**، آیت: ۱۳۷۔

۴۰۔**السجدہ**، آیت: ۲۴۔

۴۱۔**یوسف**، آیت: ۹۰۔

۴۲۔**الزمر**، آیت: ۱۰۔

۴۳۔ابن حبان، **الصحیح**، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۳ء، ج۸، ص۱۹۲۔

۴۴۔بخاری، **الجامع الصحیح**، باب الصبر عن محارم اللہ، ج۵، ص۷۵۔

۴۵۔**آل عمران**، آیت: ۱۸۔

۴۶۔**النحل**، آیت: ۹۰۔

۴۷۔بخاری، **الجامع الصحیح**، ج۳، ص۱۲۸۲۔ قشیری، امام مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، ج۳، ص۱۲۹۔

۴۸۔نسائی، **سنن المجتبیٰ**، کتاب القسامۃ، باب تبرئۃ اھل الدم فی القسامۃ۔